© rasailojaraid.com

نظـــرات

مسلمانوں کی دینی تاریخ میں بالعموم یہ ہوتا رہا ہے کہ جب بھی زمانے کے نئے حالات اور اس کی حتمی و شدید ضرورتوں کے تحت ان کے ہاں کے مروجہ نظام کی کسی شق میں، جس پر کہ پہلے اجماع ہوچکا تھا، جزوی یا کلی تبدیلی کی خاطر احکام اسلامی کی کوئی نئی تعبیر پیش کی گئی اور اس طرح قرآن و سنت کی روشنی میں نت نئے پیدا ہونے والے حالات سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش ہوئی تو علماء کی غالب اکثریت نے شروع شروع میں اس کی سخت مخالفت کی اور نئی تعبیر اور اس قسم کی کوشش کو مردود قرار دینے میں مذہب، سلف اور اجماع کے نام سے جو وہ حربے استعمال کرسکتے تھے، بے دریغ استعمال ہوئے۔ علماء کا اسلام کے صدر اول کے کچھ زمانے کو چھوڑ کر ہمیشہ ہی سے یہی موقف رہا ہے۔ اور ایک حد تک یہ سمجھ میں بھی آتا ہے۔ کیونکہ علمائے کرام دینی اقدار اور شرعی روایات کے حامل ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے ان ہر دو کا تعلق ماضی سے ہے۔ اس لئے علماء کا قدامت پسند ہونا، خود ان کے منصب کا ایک لازمہ ہے۔ قدامت پسندی سے ہماری مراد، علماء کا دینی و ملی روایات کا محافظ ہونا ہے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ ملت کی بقا اور سالمیت کے لئے یہ قدامت پسندی ضروری اور لابدی ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زندگی پیہم دواں ہردم رواں ہے۔ جیسے جیسے یہ آگے بڑھتی ہے، اس کے نتیجے میں نئے حالات وجود میں آتے ہیں۔ اور ان سے متعلق نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اب اگر کوئی جماعت ان حالات و مسائل کو نظر انداز کرتی ہے۔ اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے قدیم اقدار و روایات اور جدید تقاضوں اور ضرورتوں کے درمیان تطبیق دینے کی کوشش نہیں کرتی۔ وہ اپنی مخصوص قدامت پسندی ہی پر اکتفا کرکے بیٹھ جاتی ہے اور وہ ہر قدیم کو حق اور جدید کو باطل سمجھتی ہے تو اس جماعت کا جو حشر ہوتا ہے اس کی ایک واضح مثال امت مسلمہ کی پچھلے پانچ چھ سو سال کی سرگذشت ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ماضی کے کلی انکار اور اسے سر تاپا عار قرار دینے سے کبھی صحت مند تخلیق نہیں ہوسکتی۔ اس کے لئے ضرورت قدیم اور جدید میں تطبیق کی ہوتی ہے۔ اس عملی تطبیق کے لئے قدامت پسندی بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ جدت پسندی۔

یہاں ذکر ارکان دین اور عبادات کا نہیں۔ وہ یقیناً غیر متبدل ہیں۔ اور اپنی اسی شکل میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی محکمات دین ہیں۔ اور ملت کی عمارت انہی بنیادوں پر کھڑی ہے۔ لیکن جہاں تک نفس عمارت کا تعلق ہے اس میں تو ظاہر ہے، اس کے ساکنوں، جہاں یہ عمارت ہے، وہاں کی آب و ہوا اور اس کے ماحول اور محل وقوع کی رعایت ضروری ہوگی۔ ورنہ یہ عمارت بے کار ہو کر رہ جائے گی۔

اب مسلمانوں کی دینی تاریخ میں جہاں یہ ہوتا آیا ہے کہ علما نے شروع شروع میں ہر نئی تعبیر اور نئی کوشش کی مخالفت کی، وہاں بعد میں یہ بھی ہوتا ہے کہ جب زمانے کے تقاضوں اور ملت کے عمومی مفاد کی بنا پر مروجہ نظام میں تبدیلی ناگزیر ہوگئی تو اسی نئی تعبیر اور نئی کوشش کو تھوڑے رد و بدل کے بعد جمہور نے اپنا لیا اور اس پر امت کا اجماع ہوگیا۔ اس طرح یہ تبدیلی علمائے کرام کے لئے قابل قبول ہوگئی۔ اور ملت کے فکر و عمل کا قافلہ بحیثیت مجموعی ایک مقام پر رک کر نہ رہ گیا اور وہ گو نہایت سست روی ہی سے سہی، بہر حال کچھ نہ کچھ آگے بڑھتا گیا۔

حضرت امیر معاویہ کے بعد خاندانی بادشاہت، علم کلام کی ترویج کے بعد یونانی فلسفہ اور امام غزالی کے بعد تصوف کو مسلمانوں نے جس طرح ”اسلامی“ مانا، وہ تو بہت پہلے کی باتیں ہیں۔ انہی دنوں جمہوریت، اور عرب ملکوں میں جمہوریت (دیموقراطیہ) کے ساتھ ساتھ سوشلزم (اشتراکیہ) کو جس طرح اسلامیت کا لازمی شعار بتایا جارہا ہے، اس کا علم سب کو ہے۔ ہم یہاں کسی خاص زمانے کے ایک معین نظام کو ”اسلامی“ ماننے کے اس رجحان کی تنقیص نہیں کر رہے۔ ہمارا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ ایک نظام کی تشکیل و تعیین میں اس زمانے کی ضرورتوں کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ اور اسے قبول کئے بغیر کوئی نظام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خوش اسلوبی سے نہیں چل سکتا۔ جب مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی خاندانی بادشاہت کو ''اسلامی'' مانا تو اس وقت ایک سلطنت کے استحکام و تسلسل کے لئے یہ بہترین نظام تھا اور جب وہ جمہوریت، اور جمہوریت کے ساتھ اشتراکیت کو اسلامیت کے لوازم مان رہے ہیں تو اس کی وجہ بھی ملت کا مفاد عمومی ہے۔ یعنی مفاد عمومی کے لئے جس نظام یا اس کے کسی حصے پر امت کا اجماع ہوجائے تو وہ عقلاً و عملاً اسلامی مانا جاتا رہا ہے۔ اب جہاں تک مفاد عمومی کے عملی مصادیق و مفاہیم کا تعلق ہے، زمانے کے ساتھ ان میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے بالکل شروع میں محمد علی پاشا نے مصر میں اپنی سلطنت قائم کی۔ اس سے کچھ پہلے مصر پر فرانسیسی تقریباً تین سال تک مسلط رہ چکے تھے اور اب دونوں فرانسیسی اور برطانوی حکومتوں کی اس پر للچائی ہوئی نظریں تھیں۔ محمد علی پاشا ان پڑھ ہونے کے باوجود جانتا تھا کہ اگر مصر میں صدیوں سے آباد عیسائی قبطی اقلیت کی وفاداری اس کے مسلمان فرمانرواؤں سے نہیں ہوتی، تو یورپ کی طاقت ور عیسائی طاقتیں اس اقلیت کو آلۂ کار بنانے میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھیں گی۔ چنانچہ مصر کے نئے نظام حکومت میں جزیہ منسوخ کردیا گیا اور سب مصریوں کے ایک سے حقوق اور ایک سی ذمہ داریوں کے اصول پر جدید مصر کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔

اس زمانے میں محمد علی پاشا کی یہ ایک بہت بڑی تجدد پسندی تھی، لیکن آج سب کا اس پر اتفاق ہے اور شاید ہی کوئی ایسا قابل ذکر عالم دین ہو جو اپنے ہاں کی حکومت سے دین و شرع کے نام سے مطالبہ کرے کہ وہ غیر مسلموں سے جزیہ وصول کرے۔ بے شک ہمارے ہاں ایک جماعت کچھ عرصہ پہلے اس طرح کے ''اسلامی نظام'' کی بڑی شد و مد سے داعی تھی لیکن اب وہ اس سے مکمل توبہ نصوح کر چکی ہے اور جمہوریت اور بے میل اور خالص جمہوریت کی حامی ہے۔ غالب نے بجا فرمایا ہے۔

اہل بینش کے لئے سیلِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی طرح کی ایک اور مثال سیاست میں عورتوں کی شرکت اور اسمبلیوں کے انتخابات میں ان کے حصہ لینے اور نمائندہ عہدوں کے لئے امیدوار کھڑا ہونے کی ہے۔ اس برصغیر میں تو دینی اعتبار سے یہ سوال ہی نہیں اٹھا، کیونکہ عورتوں کو برطانوی دور حکومت میں، جب کہ علما سے استفتا ضروری نہ تھا، یہ سب حقوق مل گئے تھے اور قیام پاکستان کے بعد ان سے یہ حقوق واپس لینا ناممکن تھا۔ اس لئے علما نے عملاً اس پر صاد فرمایا۔ اور وہ بزرگ جو اس کے خلاف تھے، وہ حالیہ صدارتی انتخاب میں خود ہی اس ضرورت کے قائل ہوگئے اور زمانے نے ان سے بآسانی وہ بات منوالی، جو استدلالاً وہ کبھی نہ مانتے۔

لیکن مسلمان عورتوں کو یہ حقوق دینے پر ایران میں جو کشت و خون ہوا اور مصر کے علما کے ایک گروہ نے اس کی جس طرح شدید مخالفت کی، اس کی تفصیلات اخبارات میں چھپ چکی ہیں۔ اب تمام مسلمان ملکوں میں عورتوں کو یہ حقوق مل رہے ہیں اور اس کا منافئ اسلام ہونا آہستہ آہستہ ختم ہورہا ہے۔

اس ضمن میں ہم ایک بات ضرور کہیں گے۔ "**کل جدید لذیذ**" انسان ہر نئی چیز کی طرف بہت جلد مائل ہوجاتا ہے۔ کیونکہ اس میں ایک تو نئے ہونے کی کشش ہوتی ہے اور دوسرے پہلی چیز کے مقابلے میں اس میں کم پابندیاں ہوتی ہیں۔ اس لئے ہر نئی چیز پر محض اس بنا پر ریجھ جاتا کہ وہ نئی ہے، خطرے سے خالی نہیں اور یہ رجحان ایک قوم کو سطحی اور اتھلا بنا دیتا ہے۔ چنانچہ اس لحاظ سے ہم اپنے قابل احترام علمائے کرام کی قدامت پسندی کو ملت کے مجموعی مفاد کے لئے ایک نعمت سمجھتے ہیں اور موجودہ قدرے حد سے بڑی ہوئی اور غیر معتدل تجدد پسندی کو قابو میں رکھنے کے لئے ایک ضروری روک مانتے ہیں۔ لیکن اس کی افادیت اس وقت تک رہے گی جب تک یہ قدامت پسندی نعمت رہے زحمت نہ بن جائے۔ اور اس کی زحمت بننے کا جو رد عمل ہوا اس کا نقشہ ترکی تو دور ہے، خود اپنے ہمسایہ ملک افغانستان میں دیکھا جاسکتا ہے۔

© rasailojaraid.com